OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

انتظار حسین کی ناول نگاری میں اسلامی تہذیبی شعور

Realization of Islamic Culture in *Intizār Hussain's* Novel Writing

Shakila Jabeen
Doctoral Candidate, Department of Urdu GC Women University, Faisalabad
Dr. Shahida Yousaf
Associate Professor, Department of Urdu, GC Women University, Faisalabad

Abstract

This paper studies the realization of Islamic culture in *Intizār Hussain's* novel writing. It argues in *Intizār Hussain's* novels many centuries of Indian Islamic culture and its evolution seems to breathe. Sensational appeal of these novels keeps eternal colors out of which Islamic color is deeply prominent. These novels can be considered such rainbow of Islamic Civilization that every color of it seems to express the meaning of Islamic Civilization and Culture and faith and functions. The deep sense of Islamic Civilization in these novels grants individuality to *Intizār Hussain* amongst the Novelists of the present era. He has used a fusion of declarative and symbolism that has increased the meaningfulness in his novels. The background technique of his novels is quite prominent.

Key words: Islamic culture, realization, novels *Intizār Hussain*

تمہید

اردو کے نام ور اور معروف ناول نگار انتظار حسین (1925ء-2016ء) کی ناول نگاری کا ایک قابلِ ذکر پہلو ان کا اپنی ناول نگاری اسلامی تہذیب کی نمائندگی کرنا دکھائیہ دیتا ہے۔وہ تہذیب جو انتشار کا شکار ہو گئی اور شکل بدل گئی۔ اسی ہند اسلامی تہذیب کی بھرپور شکل ان کی ناول نگاری میں دکھائی دیتی ہے۔ مسلمان اور ہندو ہزاروں سال ایک جگہ پر رہے اور مختلف زمانی مد و جزر کا شکار رہے۔ ہندی تہذیب مسلم تہذیب سے از حد متاثر دکھائی دیتی ہے۔ انتظار حسین کے ناولوں میں اسی اسلامی

CC BY

تہذیب کی عکاسی ہوتی ہے جو اس سرزمین میں جنم لیتی ہے اور پروان چڑھتی ہے۔ اس مضمون میں انتظار حسین کی ناول نگاری کا اسی تناظر میں جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

انتظار حسین کا علامتی شعور

ناول "چاند گہن" میں بُوجی کا کردار اسی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے جو مسلم تہذیب کے تال میل سے ہندو مسلم تہذیب کہلائی۔ جس کے نتیجے میں مسلمان پوری مسلم تہذیب کا پروردہ رہا نہ ہندو ہندی تہذیب کا۔ اس تہذیبی ملاپ کے نتیجے میں ہندوانہ توہمات و تصورات کے پھیلانے اور ماننے والے طبقوں میں دونوں طرف عورتیں ہی نمایاں رہیں۔ کیونکہ مسلم بادشاہوں نے ہندو عورتوں سے شادیاں کیں جس سے دونوں طرف کی آمد و رفت نے تہذیبی رویوں کو تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بُوجی بھی اسی تہذیب کی نمائندہ علامتی کردار ہیں جو وسوسوں اور اوہام سے اٹی ہوئی ہے اسی لئے وہ خواب میں "اُلو" کو دیکھ کر ڈر گئی کیونکہ الو کو منحوس کہنے میں ان کے تہذیبی لاشعور کا عمل شامل تھا۔ جس کے تحت اس پرندے کو نحس کہا گیا ہے۔ دوسری طرف بوجی کا زاویہ نظر مابعد الطبعیاتی اور اساطیری نوعیت کا حامل ہے۔ اس لئے ان کے ہاں جتنے بھی خوف ہیں سب کے سب مابعد الطبیعاتی تہذیب اور اساطیری اثرات کے پیدا کردہ ہیں جیسے روحوں میں بسیرا، چاند گہن ٹوٹے ستارے، بشارتیں، بلی کا راستہ کاٹنا، جوتے پہ جوتا چڑھنا، دکھائی نہ دینے والی صدائیں، بھید بھرے خواب جانوروں کا انسانی تقدیر سے وابستہ ہونا غرض کائنات کا ہر مظہر انسانی تقدیر سے وابستہ ہے اور ان اعتقادات سے پیوستہ بوجی حال کے ہر واقعہ کا ربط ماضی کے کسی نہ کسی واقع سے قائم کر لیتی ہیں کیونکہ یہ تمام اوہام و اعتقادات ان کے اس اجتماعی لاشعور کی پیداوار ہیں جو انہیں اپنے تہذیبی ورثے سے ملے۔ کیونکہ ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اعتقادات یہاں کی ابتدائی اقوام کے ہاں بطور مذہبی و اعتقادی صورت میں موجود تھے۔ بقول محمد مجیب: "درختوں اور جانوروں کی پرستش اس لیے ہوتی تھی کہ وہ روحوں کے مسکن سمجھے جاتے تھے وہ درختوں اور جانوروں کی حیثیت سے بھی پرستش کے مستحق مانے جاتے ہوں گے۔ برار کے گونڈ شیر کی پوجا کرتے ہیں بھیل بھی شیر کو مانتے ہیں، کندھ ہاتھی کی پرستش کرتے ہیں اور اسی پر آدمی بھی قربان کرتے ہیں، صوبہ متوسط کو سو نجھارے مگرمچھ کو دیوتا مانتے ہیں، ہندوؤں میں بندر، سانپ اور پیپل کی حرمت کرنا عام رواج ہے۔ موہنجوڈرو میں لنگم اور یونی کی پرستش بھی کی جاتی تھی اور بعض ہندو فرقوں میں یہ آج تک مقدس علامات مانی جاتی ہیں۔"[1] برصغیر پاک و ہند کی قدیم اقوام کے لئے درخت اور جانور قابل احترام اور پرستش کی چیزیں تھیں یہی وجہ ہے کہ یہ تصور برصغیر پاک و ہند کے لوگوں کے تہذیبی لاشعور کا حصہ ہے اور بوجی کی شخصیت بھی اسی تہذیبی لاشعور کی پروردہ ہے۔ جس کی ذہنی ساخت پر ہندی و اسلامی دونوں تہذیبوں کی اساطیر کا اثر موجود ہے۔ وہ جہاں درختوں اور جانوروں سے وابستہ اوہام کو سچ سمجھتی ہے وہیں وہ اسلامی تہذیب سے وابستہ تصورات جمعرات کو ختم دلوانا، پیروں کا احترام، نیاز اور ختم دلوانا پر بھی ایمان رکھتی ہیں، بوجی کا کردار اپنے اعتقادات و اوہام میں پوری ایک کائنات کو لپیٹے ہوئے ہے ان کے ان اوہام کا سلسلہ 1857ء کے غدر سے جڑا ہوا ہے وہ زمینی آفات کو وقت سے پہلے محسوس کر لیتی ہیں جس کے لئے وہ آفاقی علامات کو ذریعہ بناتی ہیں مثلاً ستاروں کا ٹوٹنا اور دم دار ستاروں کا نظر آنا ان کے نزدیک 1857ء کے واقعات سے منسوب ہے جب غدر پڑا تو ایسی علامات ظہور پذیر ہوا کرتی تھیں ان کی دلیل ہے: "یہ بات ان کی اماں نے خالہ جی سے سنی تھی کہ جب 1857ء میں غدر پڑا تھا تو اس سے ایک مہینہ پہلے آسمان پہ روز شام کو دُمدار ستارہ دکھائی دیتا تھا اور 14ء کی جنگ تو خود اُنہیں بھی اچھی طرح یاد تھی۔ انہوں نے اس زمانے میں خود ہی آنکھ سے متواتر سات دن تک

آسمان پر دُمدار ستارہ دیکھا تھا۔"[2] بو جی کا کردار مسلمان ہوتے ہوئے جہاں توہم پرست ہو کے تہذیبی زندگی کی علامت بنتا ہے۔ وہیں یہ کردار اپنے زمانے کے اخلاقی اور سماجی رویوں کے دورویہ ہونے سے بھی نقاب اُٹھاتا ہے کہ کس طرح ہندوستان کے باسی انگریزوں کی وفاداری کا دم بھرنے کئے لئے غیر قانونی کام کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ بو جی سبطین کے والد کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں: "وہ تو ایمانداری کی ٹر میں مرے جاتے تھے۔ روپیوں کی بوریوں کی بوریاں لے کر سرحد جاتے تھے اور پٹھانوں میں بانٹتے تھے۔ کبھی ایک پائی کی بے ایمانی نہیں کی انگریز ان کی وفاداری اور ایمانداری سے بہت خوش تھا۔ لیکن تھا بڑا خشک تنخواہ و نخواتو بڑھائی نہیں خالی خطاب دے کر ٹرخا دیا۔"[3] میاں جی کا کردار علامتی اہمیت کا حامل ہے، میاں جی جیسے کردار ہی تھے جنھوں نے ہندو مسلم تہذیب میں کھنڈت ڈالی اور قوم دشمن انگریز کو خوش کرنے کے لیے اپنی قوم، دوستوں، خاندان اولاد غرض ہر رشتے کو بالائے طاق رکھ کے ملک دشمنی کا ثبوت دیا۔

الحادی تصورات

دوسری طرف ناول کے کردار سبطین اور فیاض جدید تعلیم سے آراستہ کالجین ہیں۔ جو کالج میں آکر الحادی نظریات کے پیروکار ہو گئے یوں ان دونوں کرداروں کے توسط سے انتظار حسین 1857ء کے بعد سرسید تحریک اور دوسرے نظریات کے حوالے سے آنے والی معاشرتی تبدیلیوں کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں، کہ کس طرح برصغیر پاک وہند کے لوگ توہماتی فضا کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوئے اور نیچرل ازل کے تصورات عام ہونے لگے بقول رضی عابدی: "ایک ناپختہ شعور یکایک ایسے رجحانات کی زد میں آجاتا ہے جس کے دور رس اثرات Implication کا اسے قطعی کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔ ان میں سے ایک جمہوریت کا تصور ہے۔"[4] یہ تبدیلی ایک فیشن سمجھی گئی۔ اور توہمات کے خلاف بغاوت غیر معقول ہو کے رہ گئی الحاد بڑی ہوئی حجامتوں والے نوجوان ہوا کرتے تھے جو دور سے پہچانے جاتے۔" سبطین اور فیاض دونوں کی فکری زندگی کا آغاز الحاد اور بڑی ہوئی حجامتوں سے ہوا تھا۔"[5] ناول میں ان کرداروں کے الحادی رویے توہمات کے خلاف وہ بغاوت ہے جو دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کے اثرات کو ظاہر کرتی کہ کس طرح برصغیر پاک وہند میں تبدیلی خیالات کا آغاز ہوا۔ انتظار حسین نے اپنی ناول نگاری کے ذریعے مذہب اور مذہبی پیشواؤں پر بھی طنز کرتے ہیں جو خود تو اسلام سے پوری طرح واقف نہیں مگر اپنے مریدوں کو بندر ناچ نچواتے ہیں پیشواؤں کی مذہبی احکامات کے سلسلے میں ناواقفیت کی وجہ ہندو مسلم دونوں اقوام کا صدیوں تک ساتھ رہنا ہے جس کی وجہ سے اسلامی تہذیب ہند اسلامی تہذیب میں ڈھل گئی۔ اور مذہب ایسے اعتقادات اور توہمات کا مجموعہ بن گیا جسے تعلیم یافتہ نوجوان اور علما اسلام ماننے سے انکاری ہیں کیوں کہ "مسلمانوں کے مذہبی تہوار صرف دو تھے عیدالفطر اور عید الاضحی، لیکن برصغیر میں اس کے علاوہ بھی کئی تہوار رائج ہوئے اور عیدین کے اجتماع کے موقع پر بھی مذہبی سے زیادہ معاشرتی تہوار کا رنگ پیدا ہو گیا۔ میلاد النبی، شب برات، نوروز بھی بطور تہوار منائے جانے لگے۔"[6]

چاند گہن

"چاند گہن" کی تہذیبی زندگی کا مرکزی کردار علن کی دوکان ادا کرتی ہے جہاں ناول نگار علن، رفیا، اور کالے خان جیسے کرداروں کے ذریعے عوام کے خیالات، احساسات، اعتقادات اور تہذیبی زندگی کی عکاسی کرتا ہے یہ تینوں دوست متوسط طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ کردار ان چوپالوں اور آلاؤ کے گرد بیٹھ کے اپنے اپنے مسائل اور دنیا کے بدلتے رنگوں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں اسی لیے مصنف لکھتا ہے: "اصل بات یہ تھی کہ اس پورے کارواں میں مرکزی حثیت نہ تو کالے

خان کو حاصل تھی اور نہ رفیا کو اور نہ علن کو یہ حیثیت تو دوکان کو حاصل تھی۔ [7]" یوں انتظار حسین پاکستان بننے کے سلسلے میں پیش آنے والی زیاتیوں اور ناانصافیوں کو ۳جون اور ۱۵ اگست کے بعد حقیقتوں کا نزول کا سامنا کہہ کے اختصار سے بیان کرتے ہیں۔ جس سے قاری متجسس ہو جاتا ہے کہ کس طرح ملک کی غلط تقسیم کی گئی جس کی وجہ سے بھارت کو کشمیر کی طرف جانے والا راستہ مل گیا اور مسلمانوں اپنے جائز حق سے محروم رہ گئے۔ ہجرت کے موقع پر حق صاحب اور نمبر دار صاحب پاکستان نہیں جانا چاہتے کیونکہ وہ اپنی زمینوں اور تہذیبی ورثے سے جدا نہیں ہونا چاہیے اسی مقصد کے تحت نمبر دار صاحب اپنی بیٹی کو ہندی تعلیم دلواتے ہیں اپنے تیئں وہ ملک چھوڑنے کی بجائے وہاں رہنے کے لیے قصد کر رہے ہیں۔ سبطین کا دوست فیاض دلی جا رہا ہے لیکن سبطین چاہتا ہے کہ وہ پاکستان چلا جائے کیونکہ وہاں فیاض خان کی تحریک کے پھیلنے کا امکان قوی ہے۔ لیکن فیاض خان یہ کہہ کے انکار کر دیتا ہے:" سنو! علی گڑھ سے بہت سے تالے والے اور کچھ پینشن یافتہ ڈپٹی کلکٹر اور چالاک تھانیدار پاکستان گئے ہیں چلتے وقت ان میں سے ہر شخص نے یہی اعلان کیا تھا کہ ہم پاکستان کی تعمیر کرنے جا رہے ہیں، پاکستان ان کا استقبال کرے گا۔ ہمارا تمہارا استقبال نہیں کرے گا پاکستان کو اناڑی قفل سازوں پنشن یافتہ ڈپٹی کلکٹروں اور چالاک تھانیداروں کی ضرورت ہے ہماری تمہاری ضرورت نہیں ہے۔"[8] یہ جملے ان معاشرتی رویوں کے عکاس ہیں جو اسلام کے منافی ہیں۔ پاکستان آکے غریب مہاجرین کا استحصال کیا اور اپنی مکاریوں اور چالاکیوں کا جال بن کے یہاں لوٹ گھسوٹ کی جب کہ جو اپنی جائدادیں، حویلیاں اور پرکھوں کی روایات چھوڑ کے یہاں آئے انھیں محرومیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔

دلی میں اسلامی ثقافت

ناول میں "دلی" تہذیبی ارتقا کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے۔ اس شہر میں مسلمان کئی سو سال حکمرانی کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ دلی کا کونہ کونہ مسلم ثقافت اور ہندو تہذیب کا منہ بولتا ثبوت ہے جو اپنے پس منظر میں ہزاروں سالہ تہذیبی ڈھانچے کی شکست و ریخت، قوموں کے عروج و زوال، تہذیبی روایات کے مٹنے، ہندو مسلم اتحاد کے پارہ پارہ ہونے وغیرہ کی کئی داستانوں کو لئے ہوئے ہے۔ جیسے: "ہم یہیں ہیں اور دلی کے مسلمانوں کو پاکستان جانا ہے، کبھی تو ٹھکانے کا مکان ملے گا ہی۔"[9] نیز مثال کے طور پر یہ بیان کہ مسلمان محلوں کا عجب عالم ہے جتنے مکان ہیں، اتنی کبوتروں کی چھتریاں ہیں اگر اوپر سے کوئی دلی کو دیکھے یہاں فیاض خاں دلی کے گھروں پر کبوتروں کی چھتریوں کا ذکر کر کے مسلمانوں کے زوال کی وجوہات کی طرف علامتی انداز میں توجہ مبذول کرواتا ہے کہ کس طرح برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں نے عیش و نشاط میں کھو کے عہد ساز غلطی کی اور زوال پذیر ہوئے ان کی حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ یہاں دلی کی حالت زار کا ذکر تہذیبی ورثے کی بازیافت ہے، جب یہ دلی شاہجان کی تھی:" شاہجان کے وقت میں بھلا کس کے ذہن میں یہ بات آئی ہو گی کہ قلعہ کی فضا کی یہ گہما گہمی یہ سارا ہنگامہ ایک روز موت کے سناٹے میں غرق ہو جائے گا اور خود لال قلعہ ایک خاموش مرثیے کی شکل اختیار کر لے گا۔[10]

تبلیغ اسلام میں اولیا کا کردار

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی آمد اور اسلام پھیلانے میں سب سے اہم کردار خدمات اولیا کرام نے سر انجام دیں اسی عقیدت کی وجہ سے غالب جیسا شاعر حضرت نظام الدین اولیا کے مرزا کے احاطے میں دفن ہونے کا خواہش مند تھا، غالب کی یہ عقیدت اس کا وہ اجتماعی تہذیبی لاشعور تھا۔ جس کی وجہ سے مسلمان اپنے پیشواؤں سے عقیدت اور احترام کا رشتہ استوار کرتے ہیں اور ان بزرگوں کی آرام گاہوں کا احترام کرتے ہیں۔ یہ مقدس مقامات اب اپنا وہ مقام کھو چکے ہیں جسے دیکھ کے فیاض دکھی

ہوتا ہے کہ دلی کے سارے مزار آج ویران ہیں اور گدھوں کے مرکز بنے ہوئے ہیں۔" ویرانی دلی کے کس گوشے میں نہیں ہے ایک مہرولی پہ موقوف نہیں مجھے تو دلی کی پوری فضا میں موت کے سائے کانپتے نظر آتے ہیں۔"[11] اس ساری بربادی کو فیاض خان چاند گہن کے مماثل قرار دے کے کہتا ہے: "اس وقت لال قلعہ کو دیکھ کر مجھ پر وہ کیفیت گزری جو چاند کو گہنانے دیکھ کر گزرتی ہے۔ چاند گہن میں تپش سے زیادہ سوز کی کیفیت ہوتی ہے وہ ایک کربناک کیفیت ہوتی ہے لیکن اس میں آواز نہیں ہوتی۔ ارتعاش نہیں ہوتا۔"[12] مجموعی طور پر انتظار حسین ناول قیام پاکستان کے پس منظر کو تاریخی و تہذیبی حوالوں سے اجاگر کر کے پاکستان آنے والوں کے خوابوں کے ٹوٹنے اور اپنی تہذیب سے بچھڑنے کی کہانی ہے جس میں برصغیر پاک وہند کی کئی سو سالہ تہذیب کے بکھرنے کو خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

داستان

ناولٹ "داستان" دن سے پہلے لکھا گیا ہے اس میں انتظار حسین نے 1857ء کے باغیوں کے لیڈر بخت خان کی کہانی کو بڑھا چڑھا کے داستانوی انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ ناولٹ 1957ء کے لگ بھگ لکھا گیا اس لیے اس میں قومی تاریخ کے مختلف مراحل نظر آتے ہیں جسے برصغیر پاک وہند کے لوگوں کا روایتی تہذیبی پس منظر یا تہذیبی لاشعور کہا جا سکتا ہے عدالت علی اور حکیم جی بخت خان اور دوسرے قصوں میں ایسے الجھے ہوئے ہیں کہ تقسیم سے پہلے 1857ء میں جا نکلتے ہیں: " حکیم جی نے ٹھنڈا سانس بھر، بولے یار واب تو ہم خود داستان بن گئے۔"[13] یوں یہ ناولٹ جنگ آزادی کی تباہ کاریوں اور تقسیم کے فسادات کو نہ صرف بیان کرتا ہے بلکہ اسے اس تہذیبی ماحول کے اجڑنے سے مشروط بھی کرتا ہے جو کئی سو سال پرانا تھا وہ بستیاں وہ تہذیب و روایات سن کے سب بکھر کے رہ گئے ہیں جو برصغیر پاک وہند کے لوگوں کا ورثہ تھا۔

پیری مریدی کا تصور

انتظار حسین نے اپنی کہانی کے ہیرو کو مسلسل جدوجہد کے حوالے سے بطور مثال پیش کیا ہے۔ یہ کردار ان تمام خوبیوں اور خامیوں کا مرقع ہے جو اس اسلامی تہذیب کا خاصہ تھیں، ستاروں کا ٹوٹنا، خوابوں میں اشاروں کا ملنا، اور ان پر عوام کا ایمان لے آنا بخت خان کی ذات کا بھی حصہ تھی کیونکہ وہ اسی تہذیبی ماحول کا پروردہ تھا۔ ۵۷ء میں لُٹے ہوئے لوگوں کی داستان ہے جنھیں اپنے گھروں کے اُجڑنے اور تہذیب سے اُکھڑنے کا دُکھ ستاتا ہے ان کے لیے موجودہ زندگی میں کوئی کشش نہیں۔ ناولٹ میں یوپی کے قدیم خاندان اور اسکی حویلی کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ وہ علامتی معنویت کی حامل نظر آتی ہے اس خاندان کا حویل کے مالک ہونا بہترین تہذیبی سرمائے سے وابستہ ہونا مراد لیا جا سکتا ہے۔ یہ حویلی پرانی نسل کر لوگوں کے تہذیبی رکھ رکھاؤ کی نمائندہ ہے۔ اس کا اندازہ ناولٹ کی ابتدا میں ہی ہو جاتا جب تائی اماں کہتی ہیں: "ہمارے بڑے ابا بہت بڑے عامل تھے، ہمارا تو خاندان عاملوں کا خاندان ہے۔ آگے ہماری ہر پیڑی میں ایک عامل ہو کرتے تھے، پر بڑے ابا کے بعد سلسلہ بند ہو گیا۔"[14] تائی اماں کا یہ ملال کہ کوئی عامل نہیں اس بات کا صحیح اندازہ نہیں کہ خاندان میں کس حد تک تبدیلیاں آچکی ہیں بہ ظاہر روحانی طاقت کا زائل ہو جانا اندرونی طور پر نئی نسل اور نوجوانوں کا اس تہذیبی ورثے کو فراموش کو جانا ہے جو ان کی وراثت تھا۔ انتظار حسین کا یہ ناولٹ انسان کے ناتمام و مبہم سفر کو پیش کرتا ہے۔ جس میں انٹلیکچوئل نعرہ بازی کی بجائے سیدھی سادی کہانی بیان کی گئی ہے۔ جو یوپی کی مخصوص مسلم تہذیب کی یاد تازہ کرتی ہے۔ یہ تہذیب کس طرح رفتہ رفتہ لوگوں کی زندگیوں سے دور ہو کے بالآخر جمود کا شکار ہو گئی یہی اس ناولٹ کا موضوع ہے۔ انتظار حسین کے ناول تذکرہ کے ضمنی موضوعات میں

ایک اہم موضوع تہذیبوں کی شکست وریخت ہے۔ ناول میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں ناول نگار نے اعلی اسلامی تہذیبی قدروں شائستگی، رواداری، خلوص و حرمت اور لوگوں کی اعلی ظرفی کے نمونوں کو دکھاتے ہوئے اپنے عہد کی معاشی بد حالی کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے،

اسلامی تہذیب پر ہندی عناصر کے اثرات

تذکرہ میں دونوں قوموں کے میل جول کی بے شمار مثالیں موجود ہیں جن میں سے ایک یہ ہے پنڈت گنگا مہجور کی موت کے بعد مشتاق علی کا کہنا: "اوم کا کلمہ ماچس کی تیلی ہے۔ تیلی کو ڈبیہ پہ گھسو روشنی پیدا ہو گی۔ سارا اندھیرا دور ہو جائے گا۔ متر و اور دوستو میرا تو یہی ایمان ہے، میرا روزانہ کا وظیفہ یہ ہے کہ سونے سے پہلے سو دفعہ اوم کا ورد کرتا ہوں اور تین دفعہ نادعلی پڑھتا ہوں۔ اوم شانتی، شانتی، شانتی، یا علی، یا علی، یا علی۔"[15] تذکرہ میں وہ قصہ چہار درویش کے دسترخوان کی مثال پیش کرتے کہ جس طرح اس دور میں ہمارا دسترخوان رنگارنگ کھانوں سے سجتا تھا اور ہماری اسلامی روایات و تہذیبی ترقی بھی عروج پر تھی اپنی پھوپھی حضرت کے کھانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ہاں پھوپھی حضرت جن دنوں لکھنؤ سے آجاتی تھیں چراغ حویلی کے دسترخوان پر ایک نئی بہار آجاتی تھی۔ انناس کا مزعفر خوب شش رنگا مرغوب، شش رنگے کی ایک رکابی میں چھ ذائقے سموئے جاتے تھے اور چھ رنگ چمک دکھاتے تھے ارے اب ہم کیا کھاتے ہیں خالی چپاتی، گوشت اور چپاتی بھی اب کہاں میسر ہے۔"[16]

آگے سمندر ہے

انتظار حسین کا ناول "آگے سمندر ہے" آشوب عصر کا عکاس ہے جس کے سرورق پر احمد مشتاق کا یہ شعر ہے:

وہی گلشن ہے لیکن وقت کی رفتار تو دیکھو
کوئی طائر نہیں پچھلے برس کے آشیانوں میں

اس ناول کا موضوع مسلم تہذیب و تاریخ کی باز تافت ہے جسے ہندو دیامالا کے سائے میں ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی ہے اس طرح یہ ناول مسلم تہذیب کو ہندو مسلم تہذیب کے تناظر میں پیش کرتا ہے۔ انتظار حسین کے اس ناول کی کہانی ان مہاجرین کے گرد گھومتی ہے جو تقسیم کے بعد مختلف علاقوں سے کٹ کے پاکستان اور خاص طور کراچی میں آباد ہوئے ہیں یہ لوگ کسی طور پر اپنی تہذیب کو بھول کر کراچی کی تہذیب کو اپنانے کے لیے تیار نہیں ہیں ناول میں اسی تہذیبی المیے کو پیش کیا گیا ہے۔ ناول کی ابتدا اسی تاریخی و تہذیبی زندگی کی بازیافت کو بیان کرتے ہوئے ہوتی ہے ناول کا ہیرو "جواد حسن" تاریخ کا طالب علم ہے جو پاکستان بننے کے بعد جھگی نشین ہوا: "جھگیوں کا زمانہ مختصر تھا۔ مگر اس میں کتنا پوشیدہ تھا۔ کتنے امکانات اس کی تہہ میں تھرتھرا رہے تھے۔ کوئی کوئی زمانہ دیکھنے مین مختصر تھا مگر وہ ایک عہد ساز دور تھا اور اگر مجو بھائی کی بات مان لی جائے تو کراچی کا اصل زمانہ وہی تھا۔ "پیارے یہ جو کراچی ہے وہ تو جھگیوں کے خمیر سے اٹھا ہے۔"[17] یہ جھگی سے مکان تک کا سفر جواد حسن نے جس طرح طے کیا اور اپنے ارد گرد جو دکھایا اسے وہ تاریخی و تہذیبی تسلسل میں دیکھتا ہے: "جلدی جھگی نشین بن گئے، پھر وہ اہل سرمایہ میں شمار ہوئے۔ یادوں کا سرمایہ میرے نام لکھا گیا۔ اسی نسبت سے طعنے بھی حصے میں آئے۔ طعنے، طنز، تعریفیں، تمسخر"[18] مسلمانوں کا تعلق جس تہذیب سے ہے وہاں ہمیشہ "حق پرستی" کا راج رہا ہے تاریخی حوالے سے دیکھا جائے تو مسلم تہذیب دنیا میں منفرد تہذیب ہے اسی لیے اس کے پیروکاروں نے اس انفرادیت پر فخر کی وجہ سے کبھی مفتوح تہذیبوں کے ساتھ اشتراک نہ کیا نہ ہی انہیں اہمیت دی۔ یہی وجہ ہے کہ اندلس جیسے تہذیب یافتہ ملک میں جہاں مسلمانوں نے آٹھسو

سال حکومت کی اور یہاں مسلم تہذیب کا غلبہ رہا وہاں بھی بالآخر شکست ہی ان کا مقدر ٹھہری کیونکہ اندلسی حکمرانوں نے اس ملک کی اقوام کو سمجھا نہ تہذیب کو، اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ فاتح کو اس ملک کی تہذیبی و مذہبی زندگی کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی عرب جب مختلف علاقوں کو فتح کرتے ہوئے ایران کے راستے برصغیر پر حملہ آور ہوئے اور یہاں حکومت قائم کر لی تو ان کا سابقہ ایک منفرد قوم سے پڑا جو تہذیبی و روحانی اعتبار سے قانون شکن تھی جس کی زمین ہر بار باہر سے آنے والوں کو اپنے سینے سے لگا کے ان کے تہذیبی و قومی تشخص کو ختم کر دیتی ہے۔ لیکن اسلامی تہذیب ایسی نہ تھی کہ جو ہندو تہذیب میں گم ہو جاتی اس لیے اس نے ہندو تہذیب کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بقول گوپی چند نارنگ: "مسلمانوں کی آمد سے پہلے جتنی بھی حملہ آور قومیں ہندوستان میں آئیں وہ یا تو ابتدائی تہذیب کی حامل تھی یا نیم حالت میں تھیں اس لیے اپنا مخصوص کردار باقی نہ رکھ سکیں اور ہندوستانی تہذیب میں ضم ہو گئیں۔ ان کی بہ نسبت اسلام اپنے ساتھ ایک مکمل اور ترقی یافتہ تہذیب ہندوستان میں لایا۔ اس لیے اس کے اور قدیم ہندوستانی تہذیب کے ربط و ارتباط لین دین اور اخذ و قبول سے ایک نئی تہذیبی دھارے کا آغاز ہوا جسے ہند ایرانی یا مشترک ہندوستانی تہذیب کا نام دیا جاتا ہے۔"[19]

جواد حسن بھی اسی ہند اسلامی تہذیب کا پروردہ ہے۔ لیکن یہ تاریخی صداقت ہے کہ مسلمانوں کا اقتدار جب تک قائم رہتا ہے ٹھیک رہتے ہیں لیکن جب ان سے حکومت چھن جاتی ہے یہ ماضی پرست ہو جاتے ہیں۔ انہیں اپنی تاریخ یاد آنے لگتی ہے یوں وہ ماضی کی تہذیب اور سابقہ سلطنت کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ یہی تہذیبی لاشعور جواد حسن کے اپنے وطن سے واپس آتے ہوئے شکستگی کے جس احساس سے دوچار کرتا ہے اس کے سوتے مسلم تہذیب و تاریخ سے پھوٹتے ہیں۔ وہ اپنی بستی "ویاس پور" کو اندلس کے تہذیب یافتہ شہروں قرطبہ، اشبیلیہ، غرناطہ وغیرہ کی بدلی ہوئی تہذیب کے تناظر میں دیکھتا ہے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ: "پچھلا جنم یاد آنا تو ایک مصیبت ہے، حافظہ اپنے محدود دائرے میں گردش کرتا رہے، بس اسی میں عافیت ہے"[20] جواد پاکستان آکر کسی حد تک بے حسی کا شکار ہو گیا تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے بعد جب پھوپھی اماں کے خط پڑھے تو خود کو روک نہ پایا اور ویاس پور چلا آیا۔ ویاس پور کے لوگ وہاں موجود تہذیب کی علامتیں ہیں۔ ان میں میمونہ جواد کی بچپن کی منگیتر اس اسلامی تہذیب کا نمائندہ کردار ہے جہاں عزت و ناموس سے بڑھ کے کچھ نہیں۔ جہاں اظہار محبت کھلِ عام نہیں کیا جاتا۔ جواد اور میمونہ اتنے عرصے بعد ملنے پر بھی کھل کر بات نہ کر سکے۔ دونوں ایک دوسرے سے وہ بات نہ کر سکے جو کرنا چاہتے تھے کیونکہ ان کی تربیت جس تہذیب میں ہوئی تھی وہ ایسی باتیں کرنے سے روکتی تھی۔ ناول کی کہانی جس شہر کے گرد گھومتی ہے وہ کراچی ہے جو آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا اور مخلوط اقوام کا شہر ہے۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد سب سے زیادہ مہاجرین اسی شہر مین آکر آباد ہوئے لیکن اس شہر کی خاص بات یہ ہے کہ اس کی تہذیبی زندگی دلی، لکھنؤ، اور دوسری ریاستوں سے مختلف ہے بقول مجو بھائی اپنا شہر ست خصمی شہر ہے۔ یا اللہ اس ایک شہر میں کتنے شہر اکھٹے ہو گئے ہیں۔ جیسے یہ شہر نہ ہوا سمندر ہو گیا کہ برصغیر کی ہر ندی ہر نالہ بہتا شور مچاتا آیا اور اس میں آن ملا۔

خلاصہ بحث

انتظار حسین کے ناول مخصوص ہند اسلامی تہذیبی پس منظر کے حامل ہیں۔ ان ناولوں میں ہند اسلامی تہذیب اور اس کے ارتقا کی کئی صدیاں سانس لیتی دکھائی دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی احساساتی اپیل دائمی رنگوں کی حامل ہے۔ اور ان میں سب سے گہرا رنگ اسلامی ہے۔ اسلامی تہذیبی سرمائے کے امین ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ناول موضوع تکنیک کے اعتبار سے بھی اردو

کے عمدہ اور کامیاب ناول کہلاتے ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے ان کے ناول اسلامی تہذیب کی ایسی قوس قزح قرار دیئے جا سکتے ہیں کہ جس کا ہر رنگ، اسلامی تہذیب و ثقافت، عقائد و معمولات کی معنویت کو اُجاگر کرتا ہے۔ ان کا گہرا اسلامی تہذیبی شعور انتظار حسین کو عصرِ حاضر کے ناول نگاروں میں انفرادیت عطا کرتا ہے۔ انتظار حسین نے اپنے منفرد اسلوب سے اردو ادب کی ناول نگاری میں نئے عہد کی بنیاد رکھی ہے۔

References

[1] Intizār Hussain, *Nayā Ghar* (Lahore: Sang-i-meel Publications, 2002ء),423.

[2] Intizār Hussain, *Nayā Ghar*, 424.

[3] Intizār Hussain, *Nayā Ghar*,32.

[4] Intizār Hussain, *Nayā Ghar*, 223.

[5] Intizār Hussain, *Nayā Ghar*, 227-228.

[6] Intzār Hussain, *Chānd Gahan* (Lahore: Sang-i-meel Publications, 2002), 281

[7]Dr. Irtazā Kareem, *Intiāzr Hussain: Aik Dābistān* (Dahlī: Educational Publishing House, 1996), 87.

[8] Intzār Hussain, *Chānd Gahan* , 281.

[9]Intzār Hussain, *Chānd Gahan* ,243

[10] Intzār Hussain, *Chānd Gahan*, 234.

[11]PunjabUniversity, *Tareekh-i-Adabiāt-i-Mulimnān-i-Pakistan-o-Hind* (Lahore: University of the Punjab, n.d), 1:60.

[12] Punjab University, *Tareekh-i-Adabiāt-i-Mulimnān-i-Pakistan-o-Hind* ,31.

[13]Intzār Hussain, Din aur Dāstān (Lahore: Sang-i-meel Publications, 2007),38-39.

[14]Irtazā Kareem, *Intiāzr Hussain: Aik Dābistān* , 233.

[15]Irtazā Kareem, *Intiāzr Hussain: Aik Dābistān* ,336.

[16]Muhammad Mujeeb, *Tareekh-i-Tamddun-i-Hind* (Lahore: Progressive Books, n.d), 673.

[17]Intzār Hussain, *Majmū'a-e-Intizār Hussain* (Lahore: Sang-i-meel Publications, 2007)330.

[18] Intzār Hussain, *Majmū'a-e-Intizār Hussain* ,340.

[19]Dr. Gopī Chand, Urdu Ghazal: Hindostānī Zihn-o-Tahzeeb (Lahore: Sang-i-meel Publications, 2005),16.

[20] Intizār Hussain, *Nayā Ghar*, 42.